قانون شریعت کا امتیاز

مصنف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی

(بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

شعبۂ تحقیق واشاعت

Jamia Islamia Maseehul Uloom, Bangalore

K.S. Halli, Post Kannur Village, Bidara Halli Hobli, Baglur Main Road, Bangalore - 562149

H.O # 84, Armstrong Road, Mohalla Baidwadi, Bharthi Nagar, Bangalore - 560 001

Mobile : 9916510036 / 9036701512 / 9036708149

فہرست قانون شریعت کا امتیاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قانون شریعت کا امتیاز

دنیا میں بہت سے قوانین رائج ہیں، جن میں سے بعض مذہبی ہیں، بعض تمدنی ومعاشرتی ہیں، اور بعض سیاسی وملکی ہیں، جنہیں کسی انسانی فرد نے یا کسی قوم وجماعت نے بنایا ہے۔ ان کے بالمقابل ایک اور قانون ہے جس کو شریعت کہتے ہیں اور جو کسی بشر یا کسی قوم وجماعت کا وضع کردہ نہیں بلکہ خالقِ ارض وسماء، رب دو جہاں حضرت حق جل مجدہ کا بنایا ہوا ہے۔ اس قانون شریعت کی بے شمار امتیازی خصوصیات ہیں، ان میں سے یہاں چند اہم امتیازی خصوصیات کا ہم ذکر کریں گے۔

قانون شریعت کا واضع اللہ تعالی ہے

سب سے پہلی بنیادی وجوہری خصوصیت یہ ہے کہ قانون شریعت کا واضع (بنانے والا) اللہ تعالی ہے، جبکہ تمام دنیوی قانون خواہ وہ کسی قسم کے ہوں، انسانوں کی عقل وفہم، ان کے علم وتجربے اور ان کی رائے وقیاس پر مبنی اور منحصر ہو تے ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسلام میں اس کا کوئی جواز نہیں؛ کیونکہ اسلام میں حقِ قانون سازی صرف اور صرف اللہ کے لئے مختص ہے۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر فرمایا گیا ہے:

﴿ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ﴾ [انعام:۵۷، یوسف:۴۰و۶۷]

(یعنی حکم دینے کا حق واختیار صرف اللہ کو ہے)

اور بعض جگہ اسی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿لَهُ الْحُکْمُ وَ إِلَیْهِ تُرْجَعُوْن﴾ [انعام:٦٢، قصص:٧٠و ٨٨]

(اسی اللہ کے لئے حکم ہے،اور تم سب اسی کی جانب لوٹائے جاؤ گے)

نیز ارشادربانی ہے کہ:

﴿فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ﴾ [مؤمن:١٢]

(پس اللہ ہی کے لئے حکم ہے جوکہ بہت بلند بڑا ہے)

معلوم ہوا کہ اسلام کسی کو بھی حق قانون سازی نہیں دیتا؛حتی کہ نبی اوررسول کو بھی اس کا اختیار نہیں دیتا کہ وہ قانون سازی کریں۔چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ ایک خاص واقعہ میں نبی کریم ﷺ نے شہد کو اپنے اوپر حرام کرلیا جواللہ کے قانون میں حلال ہے،اس پر قرآن مجید میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿یٰۤاَیُّھَاالنَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ﴾ سورہ تحریم:١]

(یعنی اے نبی آپ اس چیز کو حرام کیوں کرتے ہیں جس کو حلال اللہ قرار دیا ہے)

غرض یہ ہے کہ قانون شریعت وہ ہے جس کی بناء ووضع دنیوی بہت سے قوانین کی طرح دانشوران قوم ،سماجی خدمت گاروں ،بانیان سلطنت وحکومت ، عقلائے روزگاراورلیڈران پارٹی نے نہیں کی ہے،جن سے ہروقت خطاء ونسیان بھی ممکن ہے،علم وعقل کی کمی سے غلطی وناکارگی بھی محتمل ہے،اور بشری کمزوریوں کی وجہ سے بھلائی کا فقدان یا نقصان بھی متوقع ہے، بلکہ اس قانون کوان سب کے خالق ومالک نے وضع کیا ہے جس سے خطاءونسیان کاصدورناممکن ،جس کاعلم تمام احوال واشخاص ،تمام ادوار وازمان پر محیط اور جو ہرقسم کی کمزوری وعیب سے منزہ وبری ہے،اور جوایک جانب حاکم ہے تودوسری طرف حکیم بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت اسلامی قانون کو ایک ایسی سند (Authority) فراہم کرتی ہے جس سے اسکا درجہ اعتبار بحث وجدال کی تمام تر معرکہ آرائیوں سے بہت بلند و بالا بلند قرار پاتا ہے۔

جامعیت وہمہ گیری

قانون شریعت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جامعیت وہمہ گیری پائی جاتی ہے کہ یہ قانون تمام انسانوں کی ضروریات کو پوری طرح حاوی ہے اور ان کی زندگی اور زندگی کے ہر حال کے متعلق مرتب و جامع نظام پیش کرتا ہے جو انسان کی شخصی زندگی، عائلی زندگی، قبائلی وشہری زندگی، اور ظاہری و روحانی زندگی کے ہر پہلو میں اس کی رہبری کرتا ہے۔ وہ صرف اجتماعی وسیاسی زندگی تک محدود نہیں بلکہ وہ انسان کی انفرادی وشخصی زندگی کے اصول بھی سکھاتا ہے، معاملہ عبادات وعقائد کا ہو، اخلاق وتمدن کا ہو، سیاست وحکومت کا ہو، ملازمت وتجارت کا ہو، تعلیم وتربیت کا ہو، شادی بیاہ کا ہو، طلاق وخلع کا ہو، سیر وتفریح کا ہو، غم ومصیبت کا ہو، غرض یہ کہ انسانی زندگی سے متعلق جس قسم کا بھی معاملہ ہو قانون شریعت اس میں انسان کی بھرپور رہنمائی کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قرآن کے بارے میں فرمایا تھا کہ:

" كتابُ اللّٰهِ فيهِ نَبَأُ مَنْ قبلَكم ، وخبرُ ما بعدَكُم ، وحُكمُ ما بيْنَكم . هو الفصلُ ليس بالهزل ..... و هو حَبْلُ اللّٰهِ المَتِينِ ،وهوالذِكْرُ الحَكيمُ ، هوالصِّرَاطُ المُستقِيمُ ، وهوالَّذِي لا تَزِيْغُ بِهِ الأَهْواءُ ، ولا تلتبس به الألسنةُ ، ولايَشْبَعُ به العلماءُ ، ولايَخلَقُ علٰى كثرَةِ الرَّدِّ ،

و لا تَنقَضِيُ عَجَائِبُه الخ‘‘(۱)

(یہ کتاب اللہ ہے جس میں تم سے پہلے لوگوں کے قصے بھی ہیں اور بعد والوں کی خبریں بھی ہیں اور یہ تمہارے مابین فیصلہ کرنے والا ہے، وہ فیصل ہے کوئی مذاق نہیں، وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے اور وہ ذکر حکیم ہے، وہ صراط مستقیم ہے، اور وہ ایسا کلام ہے جس سے خواہشات بھٹکتی نہیں، اس کی زبان سے دوسری زبانیں نہیں ملتیں اور جس سے علماء کبھی سیراب نہیں ہوتے اور وہ کثرت کے ساتھ دہرائے جانے کے باوجود پرانا نہیں ہوتا، اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے الخ) اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ :’’ مَنُ أَرَادَ الْعِلْمَ فَعَلَيُهِ بِالْقُرْآنِ، فَإِنَّ فِيهِ خَبَرَ الأَوَّلِيُنَ وَ الآخِرِيُنَ‘‘(جو شخص علم حاصل کرنا چاہے اُسے چاہئے کہ وہ قرآن کو لازم پکڑ لے؛ کیونکہ اس میں اگلوں اور پچھلوں کی خبریں ہیں)۔(۲)

اور بعض علماء نے کہا کہ قرآنی علوم تین قسموں پر مشتمل ہیں: ایک توحید، دوسرے تذکیر، اور تیسرے احکام، توحید مخلوقات کی اور خالق کی معرفت اور اس کی صفات وأفعال کی معرفت پر مشتمل ہے۔ اور تذکیر میں وعد و وعید، جنت و دوزخ، ظاہری اور باطنی صفائی داخل ہے اور احکام میں تمام وہ چیزیں داخل ہیں جس کا انسان مکلّف کیا گیا ہے۔(۳)

قاضی ابوبکر بن العربی نے اپنی کتاب ’’قانون التأویل‘‘ میں فرمایا کہ:

’’قرآن پچاس علوم، اور چار سو علوم، اور سات سو علوم اور سات ہزار علوم پر مشتمل ہے۔(۴)

---

(۱) رواہ الترمذي: ۲۸۳۱، والحديث ضعيف كما قال الإمام الترمذي (۲) سنن سعيد بن منصور: ۱/۷، وشعب الایمان بیہقي: ۲/۳۳۲ (۳) الاتقان فی علوم القرآن: ۲/۱۶۳ (۴) الاتقان فی علوم القرآن: ۲/۱۶۳

قرآنی علوم کا سب سے زیادہ جامع تعارف و تجزیہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے پیش کیا ہے، آپ نے معانیٔ قرآن پر نظر ڈالتے ہوئے معانیٔ قرآن کو پانچ قسموں میں تحلیل کیا ہے، یعنی معانی ومضامین قرآن مجید کو جلی عنوانات میں تقسیم کیا جائے تو وہ پانچ عنوانات کے تحت آجاتے ہیں:

(۱) **علم التذکیر بآلاء اللّٰہ**، یعنی اللہ تعالی کی نعمتوں کی یاد دہانی پر مشتمل آیات ومضامین۔

(۲) **علم التذکیر بایّام اللّٰہ**، یعنی گزشتہ زمانوں اور ایام میں ہونے والے واقعات وحوادثات اور گزشتہ نبیوں اور ان کی امتوں کے احوال وکوائف کی یاد دہانی پر مشتمل آیات ومضامین۔

(۳) **علم التذکیر بالموت ومابعد الموت**، یعنی موت اور موت کے بعد کی زندگی کی یاد دہانی پر مشتمل آیات ومضامین۔

(۴) **علم المناظرہ**، یعنی غیر قوموں کو اسلام کی طرف لانے اور اس کی حقانیت وصداقت کو آشکار کرنے کے لئے دلائل و براھین کی روشنی میں گفتگو اور ان پر اتمام حجت۔

(۵) **علم الاحکام**، یعنی زندگی گزارنے اور اللہ کی مرضی کے مطابق جینے کے لیے ان اصول وقوانین کا علم جو انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام مراحل میں اسکی رہنمائی کرتے ہیں، اس میں عقائد، اعمال، اخلاق، معاشرت، معاملات، سیاست تمام شعبے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف دیگر قوانین اس جامعیت وہمہ گیری سے خالی ہیں، دنیا کے بیشتر مذاہب اپنے ماننے والوں کو صرف پوجا پاٹ کی چند بے جان رسمیں سکھاتے ہیں، اور بعض مذاہب اس سے آگے بڑھکر چند اخلاقی تعلیمات بھی پیش

کرتے ہیں، لیکن کوئی قانون دنیا میں ایسا نہیں جو زندگی کے ہر رخ اور موڑ پر انسان کی رہبری کا فرض ادا کرتا ہو جیسا کہ قانون شریعت انسان کی ہر موقعہ پر رہبری کرتا ہے انگلستان کے مشہور و نامور مؤرخ ڈاکٹر گبن اپنی مشہور کتاب ''سلطنت روما کا انحطاط و زوال'' کی جلد ۵/ باب ۵۰/ میں لکھتے ہیں:

''قرآن کی نسبت بحر اٹلانٹک سے لیکر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے کہ یہ پارلمنٹ کی روح ہے، قانون اساسی ہے، اور صرف اصول مذہب ہی کے لیے نہیں بلکہ احکام تعزیرات اور قوانین کے لیے بھی ہے؛ جن پر نظام کا مدار ہے، جن سے نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے، جن کو حیات انسانی کی ترتیب وتنسیق سے گہرا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی شریعت سب پر حاوی ہے، یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہاں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ (۱)

الغرض اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اور اللہ کی شریعت مخلوق کے لئے ہدایت، مسلمانوں کے لئے زندگی کا دستور، متقی لوگوں کے لئے ایک منہاج ہے، اوراسی لئے وہ ہدایت الٰہی کا ایک جامع خزانہ، کامل تہذیب وتمدن کا منبع، مکمل زندگی کا لائحۂ عمل ہے۔

معقولیت

قانون شریعت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معقولیت وعقلیت پسندی پائی جاتی ہے، چنانچہ حضرات علماء وائمہ نے قانون شریعت کی معقولیت کو اپنی تصانیف وتالیفات میں پوری شرح وبسط کے ساتھ واضح کیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن القیم، امام غزالی، امام رازی، اور پھر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور

(۱) بحوالہ معارف القرآن ۱/۱۶۳

حضرت مولانا قاسم نانوتوی پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمھم اللہ وغیرہ نے اس پہلو پر سیر حاصل بحثیں فرمائی ہیں۔

علامہ ابن القیم نے اپنی کتاب ''اعلام الموقعین'' میں ایک فصل مستقل اس عنوان پر قائم فرمائی ہے:" فصل فی بیان انه لیس فی الشریعة شیء علی خلاف القیاس "(یعنی یہ فصل اس بیان میں ہے کہ شریعت میں کوئی بات خلاف عقل نہیں)۔(۱)

اسی فصل میں بہت طویل کلام کے بعد آخر میں فرماتے ہیں کہ:

''یہ چند چیزیں ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ شریعت میں کوئی شئی خلاف عقل نہیں ہے اور یہ کہ قیاس صحیح اس کے اور اوامر ونواہی کے ساتھ وجوداً وعدماً دائر ہے، جس طرح معقول صحیح اس کے اخبار کے ساتھ وجوداً وعدماً دائر ہے، لہذا اللہ نے اپنے رسول کو ایسی بات کی خبر نہیں دی جو عقل صریح کے خلاف ہو اور نہ ایسی چیز کو مشروع کیا جو عدل وانصاف کے مناقض ہو۔(۲)

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے مقدمہ میں فرمایا کہ ''بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ احکام شرعیہ میں مصلحتوں کی رعایت نہیں کی گئی ہے اور اعمال میں اور ان کی جو اللہ نے جزاء مقرر کی ہے اس میں کوئی مناسبت نہیں ہے، اور شریعت کا مکلّف بنانا ایسا ہی ہے جیسے آقا اپنے غلام کی عبدیت وغلامی کا امتحان لینا چاہتا ہے تو کبھی پتھر اُٹھانے یا کسی درخت کو چھونے کا حکم دیتا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ امتحان ہو جائے، جب وہ اطاعت کرتا ہے یا مخالفت کرتا ہے تو اس کے مطابق اس کو بدلہ دیا جاتا ہے مگر یہ گمان وخیال فاسد ہے جس کی حدیث وخیر والقرون کا اجماع تکذیب کرتے ہیں۔(۳)

---

(۱) اعلام الموقعین: ۳/۲ (۲) اعلام الموقعین: ۱۷/۲ (۳) حجۃ اللہ البالغۃ: ۴/۱-۵

ڈاکٹر گبن کا قول اوپر ہم نے نقل کیا ہے جس میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ شریعت کے تمام قوانین واصول نہایت دانشمندانہ ہیں جن کی نظیر کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔

مزید سنئے کہ ''ہربرٹ لکچرز'' میں ہے کہ شریعت اسلام نہایت اعلی درجہ کے عقلی احکام کا مجموعہ ہے، جن فضائل واعمال کی اس میں ہدایت کی گئی ہے وہ ایسے برگزیدہ اور شائستہ ہیں کہ کسی مشہور مسیحی قسیس کی ہدایتیں بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ (۱)

میں یہاں شریعت کی معقولیت کے لیے ایک دو مثالیں پیش کروں گا جن کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ غیر معقول ہیں، ان مثالوں سے واضح ہوگا کہ ان کو غیر معقول سمجھنا خود ہی ایک غیر معقول خیال ہے۔

مثلا مرد کے لیے چار شادیوں کی اجازت اور عورت کے لیے صرف ایک مرد پر کفایت، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خلاف عقل ہے، وہ کہتے ہیں کہ دونوں کو چار چار کی اجازت ہونا چاہئے یا نہیں تو دونوں کے لیے ایک شادی کا حکم ہونا چاہئے، مگر شریعت کے اس حکم کی معقولیت کے لیے اولاً ان امور پر غور کیجئے:

(۱) بعض مرد، صرف ایک عورت سے اپنی جنسی خواہش پوری نہیں کرسکتے کیونکہ ان میں جنسی قوت اور شہوت زیادہ ہوتی ہے۔

(۲) کبھی عورت اتنی کمزور وضعیف ہوتی ہے یا بیماری میں مبتلا ہوتی ہے کہ وہ مرد کی خواہش کو پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتی۔

(۳) ہر ماہ عورت حیض کی گندگی سے ملوث ہوتی اور ولادت کے وقت نفاس سے دوچار ہوتی ہے اور ان دنوں میں شرعاً بھی مرد اس سے صحبت نہیں کر

(۱) بحوالہ المصالح العقلیۃ للاحکام النقلیۃ: ۴۱۴

سکتا اور نہ عورت ان دنوں میں ایسے موڈ میں ہوتی ہے کہ وہ مرد کے لیے اپنے آپ کو تیار کر سکے۔

اب غور یہ کرنا ہے کہ ان صورتوں اور مواقع پر، مرد کو دوسری، تیسری شادی کی اجازت دینا تا کہ وہ کسی غیر فطری عمل میں مبتلا نہ ہو، کیا غیر معقول بات ہے یا نہایت معقول اور غایت درجہ کی حکمت ومصلحت پر مبنی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ معقول بھی ہے اور پُر از حکمت بھی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ بعض صورتوں میں عورت کے لیے بھی ایک سے زائد شادی کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کی شریعت نے کیوں اجازت نہیں دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی شریعت کی معقولیت کی بہت بڑی اور زبردست دلیل ہے؛ کیونکہ اگر عورت کو بیک وقت ایک سے زائد شادیوں کی اجازت دی جائے تو ایک نقصان یہ تھا کہ نسب ضائع ہو جاتا، اور پیدا ہونے والے بچہ کو کس مرد کا قرار دیا جائے؟ اس میں اختلاف عظیم اور فساد عریض برپا ہوتا؛ دوسرا نقصان یہ تھا کہ غیرت کی بنا پر مرد ایک دوسرے کے قتل کے درپے ہو جاتے، اور اس میں خود عورت کے لیے بھی بڑی مشکل پیش آتی کہ وہ آخر کس مرد کی مانے، کس کی نہ مانے؟ ان مردوں میں غیرت کی بنا پر اختلافات و جھگڑے ہوتے اور عورت کے لیے بھی پریشانی کا سبب بنتے۔ لہذا شریعت نے، مرد کے لیے تو تعدد ازواج کو جائز رکھا، مگر عورت کے لیے اس کو حرام قرار دیا، اور یہی عقل کا تقاضا ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری مثال یہ ہے کہ شریعت نے طلاق کا اختیار وحق مرد کو دیا ہے عورت کو نہیں، اس کے متعلق بعض جدت پسند لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا اختیار دیا گیا ہے اسی طرح عورت کو بھی اختیار ہونا چاہئے تا کہ وہ بھی ناپسندیدہ شوہر کو طلاق دیکر اس سے رہائی حاصل کر سکے۔

یہ حضرات جس انداز سے اس بات کو پیش کرتے ہیں اس سے دو باتیں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں: ایک یہ کہ ان لوگوں نے اسلام کے نظام طلاق کو نہ پورا پڑھا ہے اور نہ پوری بصیرت سے مطالعہ کیا ہے بلکہ اس عادلانہ نظام میں سے درمیانی ایک شق کو کاٹ کر صرف اسی ایک شق کو دیکھا اور اسی کا مطالعہ کیا ہے اور مطالعہ بھی آزاد عقل سے نہیں بلکہ اس عقل سے کیا ہے جس پر مغرب کی ناپاک اور ٹیڑھی عینک لگی ہوئی ہے، لہٰذا اس مطالعہ سے ان کو اسلام کی خوبیاں اور کمالات نظر نہیں آتے بلکہ اس ٹیڑھی عینک کی وجہ سے اسلام بھی ٹیڑھا نظر آتا ہے، انصاف کی جگہ ظلم دکھائی دیتا ہے، معقولیت کی جگہ نامعقولیت نظر آتی ہے، مگر یہ نہیں سمجھتے کہ یہ اس مغربی عینک کی وجہ سے ہے، ورنہ اسلام اپنی جگہ درست و صحیح سالم ہے۔ غرض ان لوگوں نے اسلام کے نظام طلاق کا نہ پورا مطالعہ کیا ہے اور نہ پوری بصیرت کے ساتھ کیا ہے۔ دوسری بات جو ان کے طرز عمل سے واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے عورت کی نفسیات اور اس کے مزاج و فطرت سے بھی آگہی حاصل نہیں کی ہے، ورنہ وہ ہرگز یہ مطالبہ نہ کرتے کہ عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہونا چاہئے۔

غور کیجئے کہ اسلام نے جس طرح مرد کو طلاق کا اختیار دیا ہے اسی طرح عورت کو خلع کا حق عطا فرمایا ہے، البتہ خلع میں مرد کی منظوری ضروری ہے، اگر واقعی ضرورت کی بنا پر عورت خلع کا مطالبہ کررہی ہے اور مرد اس کو منظور نہیں کررہا ہے تو پھر اللہ نے عورت کی رہائی کے لئے ایک اور راستہ رکھا ہے، وہ یہ کہ قاضی کے دربار میں مقدمہ دائر کرے اور اس کے ذریعہ نکاح کو فسخ کرالے۔ اگر کسی جگہ قاضی نہ ہو تو فقہ اسلام میں قاضی کے قائم مقام پنچایت کو قرار دیا گیا ہے لہٰذا کسی بھی جگہ کی شرعی پنچایت عورت کے نکاح کو فسخ کرسکتی ہے۔ (۱)

(۱) دیکھو الحیلۃ الناجزۃ از حضرت تھانوی

اس سے واضح ہوا کہ جس طرح اللہ تعالی نے مرد کو عورت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے طلاق کا راستہ بتایا ہے،اسی طرح عورت کے لئے بھی ضرورت کے موقعہ پر مرد سے نجات حاصل کرنے کی راہیں کھولی ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ مرد کو طلاق میں خود مختار بنایا گیا لیکن عورت خلع کی صورت میں بھی مرد سے منظوری کی اور فسخ کی صورت میں قضاء قاضی کی محتاج و پابند کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عورت کی نفسیات سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ اس میں جلد بازی، جذبات سے مغلوبیت اور ناعاقبت اندیشی، مرد کی بنسبت زیادہ پائی جاتی ہے، اگر عورت کو مرد کی طرح اس میں خود مختار و آزاد رکھا جاتا تو شاید ہی آج کوئی خوش قسمت ایسا ہوتا جس کو اس کی بیوی کی طرف سے طلاق نہ ملی ہوتی؛ کیونکہ وہ ذرا ذرا سی بات پر بہت بڑے بڑے فیصلے کرنے پر تل جاتی ہے؛ اور اپنی اور اپنے بچوں تک کی عاقبت وانجام پر نظر کرنے تیار نہیں ہوتی، اس کا تقاضا یہی ہے کہ عورت کو اس میں آزاد نہ رکھا جائے اور غور وفکر کے مواقع پیدا کرنے کے لئے یا اس کی رائے کے صحیح و درست ہونے کی تصدیق کے لئے اس کو مرد کی اجازت یا قاضی کے حکم کا پابند رکھا جائے، اور یہی شریعت نے کیا ہے۔

غرض یہ کہ شریعت کا قانون، نہایت معقول اور حکمتوں سے لبریز ہے مگر اس کو سمجھنے کے لیے ویسی عقل کی بھی ضرورت ہے جو ان حِکَم واسرار تک رسائی کی صلاحیت رکھتی ہو۔

دائرہ کار کی وسعت وعمومیت

ایک خصوصیت قانون شریعت کی یہ ہے کہ اس کا دائرہ کار تمام زمانوں، تمام جگہوں اور تمام انسانوں کو وسیع ہے، دنیا کے کسی قانون کا دائرہ کار اپنے اندر اتنی وسعت وعمومیت نہیں رکھتا۔ اسی لیے نبی کریم علیہ السلام کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے

کہ آپ یہ اعلان فرمادیں کہ:

﴿ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [سورہ :الاعراف](میں تم سب کے لیے رسول ہوں)

یعنی میں کسی خاص زمانے یا کسی خاص علاقے یا کسی قوم وجماعت کے لئے مخصوص نہیں ہوں اور نہ میری نبوت مخصوص ہے، بلکہ میں سب کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔اسی لیے قانون شریعت رنگ ونسل کی تحدیدات اور قبیلوں وشعبوں کے امتیازات ،جغرافیائی حد بندیوں اور زمانے کے حدود سے بلند وبالا ہے، وہ جس طرح عربوں کے لیے آیا ہے اسی طرح ہندیوں اور پاکستانیوں ،چینیوں کے لیے بھی نازل ہوا ہے،امریکہ اور یورپ کی گوری نسلیں ہوں یا حبشہ کی کالی اقوام، سب اس کے مخاطب ہیں ،زمانہ آج سے چودہ سال قبل کا ہو یا یہ نئے آلات ، جدید انکشافات اور محیر العقول تحقیقات کا دور ہو، قانون شریعت کا دائرہ سب پر حاوی ومحیط ہے۔

دنیا کے اکثر قوانین نسلی وقومی امتیازات ،جغرافیائی حد بندیوں اور زمانی حدود سے متاثر ہوتے ہیں،اس لیے وہ کسی جگہ چلتے ہیں تو دوسری جگہ نہیں چل سکتے؛ کسی قوم میں چلتے ہیں تو دوسری قوم میں مفلوج و بیکار ہوجاتے ہیں؛ ایک زمانہ میں کام آتے ہیں تو دوسرے زمانوں میں ناکام ہوجاتے ہیں، اور اسی لیے ان میں تغیر وتبدل کی ضرورت بھی پیش آتی ہے اور زمانہ کی تغیر پذیری ان کو متاثر کردیتی ہے، مگر قانونِ شریعت کا امتیاز یہ ہے کہ وہ نہ کبھی متغیر ہوتا ہے نہ کسی تغیر سے متاثر ہوتا ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ وحالت کے تغیر وتبدل سے احکام کو بھی

بدلتا رہنا چاہئے مگر یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ دریں صورت کسی قانون کے مرتب ومدون کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب زمانہ کی نیرنگیوں اور حالات کی تغیر پذیریوں سے قانون کو بدلتا رہنا ہے تو اسے مرتب کرنے کی بھی ضرورت نہیں، بلکہ قانون کو زمانے ہی کے حوالے کر دیا جانا چاہئے کہ وہ خود زمانے کے تقاضوں سے بنتا اور پھر بدلتا رہے، لیکن سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ بات بے عقلی کی ہے کہ قانون کو حالات وزمانے پر چھوڑ دیا جائے۔ اسی لئے دنیا کی ہر حکومت قانون بناتی ہے، اور اس کے لئے عقل مندوں کی ایک جماعت کا انتخاب بھی کرتی ہے۔ معلوم ہوا کہ قانون کو زمانے کے حوالے کرنا ایک نادرست اور غلط وبے معنی خیال ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے رسالے ''اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں''میں خوب فرمایا ہے کہ:

''یہ کسی تھرمامیٹر کی تو تعریف ہوسکتی ہے کہ وہ درجۂ حرارت وبرودت بتلائے یہ مرغ بادنما کی بھی تعریف ہوسکتی ہے جو کسی ہوائی اڈے یا اونچی عمارت پر لگایا گیا ہے، صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہوا کس طرف کو چل رہی ہے لیکن مذہب کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ مذہب کو اس کے بلند مقام سے اتار کر تھرمامیٹر یا مرغ بادنما کا مقام دینا چاہتا ہو کہ مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ صرف زمانے کی تبدیلیوں کی رسید دیتا رہے، اکلناج (Acknowledge) کرتا رہے، یا اس کی عکاسی کرتا رہے۔[1]

مگر اس تقریر سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قانونِ شریعت موجودہ دور میں اور نئے احوال وظروف میں قابل عمل ولائق نفاذ نہیں بلکہ بتانا یہ ہے کہ یہ قانون احوال

---

(۱) اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں: ۱۰-۱۱

وازمان وظروف کا تابع نہیں ،ہاں اس میں ایسی صلاحیت ہے کہ وہ تمام احوال وظروف میں قابل عمل ولائق نفاذ ہے، اس میں ایسی لچک رکھی گئی ہے کہ تغیر پذیر احوال وظروف میں اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے،تو پھر قانون کو بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ اوراس کے قابل عمل ولائق نفاذ نہ ہونے کا کیا سوال؟

پھر یہ بھی ذہن میں ہونا چاہئے کہ احوال وزمانے میں جو تغیر ہوتا ہے وہ کبھی صالح ہوتا ہے اور کبھی فاسد ہوتا ہے ،قانونِ شریعت صالح تغیر کا تو ساتھ دیتا ہے لیکن فاسد تغیر کا کبھی ساتھ نہیں دیتا،اور ہر شخص جسے اللہ تعالے نے کچھ بھی عقل وفہم عطا فرمائی ہے اس کا انکارنہیں کرسکتا کہ صالح تغیر کا ساتھ دیناہی عقل وانصاف کا تقاضہ ہے نہ یہ کہ ہر تغیر کا۔

آج کی دنیا میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ جھوٹ ،مکروفریب ،فحش وبے حیائی وغیرہ امراض خبیثہ ایک فن کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں،اسی طرح سیاست کی دنیا میں وہی کامیاب سمجھا جارہا ہے جو جھوٹ اورمکروفریب میں ماہر ہو۔ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک انقلاب اور تغیر ہے مگر صالح نہیں، فاسد تغیر ہے۔کیا اس بنیاد پر کہ آج یہ تغیر رونما اور واقع ہے ہم جھوٹ کو فضیلت اور مکروفریب کو نیکی قرار دینے کے مجاز ہیں؟ یا کوئی حکومت یا کوئی جماعت ایسی ہے جو ان برائیوں کو خوبی وکمال قرار دینے تیار ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا،بالکل اسی طرح آج سود میں لوگ ملوث ہوں تو اس تغیر کی بنا پر سود کو حلال نہیں کیا جاسکتا ہے، رشوت خوری کا بازار گرم ہو تو اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا جاسکتا، جوے اور سٹہ کا رواج چل پڑا ہو تو یہ اس کے جواز کی دلیل نہیں ہوسکتی۔

اگر حالات اورزمانہ کے ہر تغیر کی وجہ سے احکام وقوانین کو بدل دیا جانا

چاہیئے تو پھر آج ڈاکہ زنی، لوٹ مار، چوری سب جائز ہونا چاہیئے، کیا دنیا کا کوئی قانون، خواہ وہ کتنا ماڈرن کیوں نہ ہو، ان چیزوں کو جائز قرار دیتا یا دے سکتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں، تو پھر اسلام ہی کیوں اپنے قانون کو بدلنے لگے، اور اگر نہ بدلے تو کیوں اس کو نا قابل عمل سمجھا جائے؟

غرض یہ کہ اسلام کا قانون اس تغیر پذیر دنیا اور ان احوال وظروف میں بھی اسی طرح قابل عمل ہے جس طرح آج سے کئی صدیوں پیشتر قابل عمل تھا۔ پس وہ تمام انسانوں اور ہر زمانے کے انسانوں کے لیے عام ہے اور ہر جگہ اور ہر حالت میں چلنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر برناڈ شاہ نے جو ایک مشہور انگریز مفکر ہے کہا کہ:

''اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو میرے نزدیک زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ موافقت کرنے کی صلاحیت کا مالک ہے، جو ہر زمانے کو اپیل کرسکتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

" It is only religion, which appears to me to possess that assimillating capacity to the changing phase of existence, which can make its appeal to every age."

عدل وانصاف

اسلام کے قانون کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر عدل وانصاف کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے، اور اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ یہ قانون، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اللہ کا بنایا ہوا قانون ہے۔ اگر کسی جماعت، قوم، فرد کا بنا ہوا ہوتا تو اس میں تعصّبات کا دخل ہوتا، دشمنی وعداوت کا دخل ہوتا، اپنے اور غیر کے

فرق کا لحاظ ہوتا، جس کے نتیجہ میں مساوات اور عدل وانصاف قائم نہ رہ سکتا، لیکن یہ تو اللہ کا قانون ہے، جس کی نظر میں تمام انسان یکساں ہیں، وہاں تعصّبات، عناد ودشمنی، دوستی اور غیرت کا کوئی دخل ہی سرے سے متصور نہیں، اس لئے جو قانون بھی وہاں سے بنے گا وہ محض عدل وانصاف پر اور حق وصداقت پر مبنی ہوگا۔

اس بات کا کچھ اندازہ اس سے ہوگا کہ اللہ تعالے نے قرآن مجید میں کفار سے دشمنی میں بھی حد سے تجاوز کی اجازت نہیں دی بلکہ اس سے منع فرمایا ہے، قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ أَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَعْتَدُوْا ﴾ [مائدہ: ۲]

(جو لوگ تمہاری دشمنی میں تمکو مسجد حرام میں جانے سے روکتے ہیں تم کو انکی دشمنی کہیں حد سے آگے بڑھنے پر نہ اُبھارے)

ایک اور موقع پر یہ ارشاد فرمایا کہ:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى أَ لَّا تَعْدِلُوْا ،اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ [المائدۃ:۸]

(کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر نہ اُبھارے کہ تم انصاف نہ کرو، بلکہ تم انصاف کا معاملہ کرو، یہ تقوے کے قریب ہے)

غور فرمایئے کہ مسلمانوں کو کفار سے عداوت ودشمنی میں تجاوز کرنے سے روکا جا رہا ہے جبکہ کفار اسلام اور اللہ ورسول کی مخالفت پر پوری طرح مستعد وکمر بستہ تھے، یہ صرف قانون الٰہی ہونیکی وجہ سے ہے۔

اسی طرح اسلام کہتا ہے کہ والدین اگر مسلمان نہ بھی ہوں تب بھی ان کے

ساتھ اچھا و بہتر سلوک کیا جانا چاہئے، چنانچہ اللہ تعالے نے بڑی اہمیت کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان کیا ہے:

﴿وَإِنْ جَاهَدَاکَ عَلٰی أَنْ تُشْرِکَ بِيْ مَا لَيْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفاً﴾[سورۂ لقمان:۱۵]

(اگر وہ دونوں یعنی والدین تجھے میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک کرنے پر مجبور کریں جن کا تجھے علم نہیں تو تو ان کی بات نہ مان، ہاں دنیا کے معاملے میں تو ان کے ساتھ بھلائی کے ساتھ معاملہ کر)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ''تفسیر معارف القرآن'' میں اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ:'' وَإِنْ جَاهَدَاك''میں یہ بتلایا گیا ہے کہ غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے کے معاملہ میں والدین کی اطاعت بھی حرام ہے، اور ایسی صورت میں کہ ماں باپ اس کو شرک و کفر پر مجبور کریں اور اللہ تعالے کا حکم یہ ہو کہ ان کی بات نہ مانو تو طبعی طور پر انسان حد پر قائم نہیں رہتا، اس پر عمل کرنے میں اس کا امکان تھا کہ بیٹا والدین کے ساتھ بدکلامی یا بدخوئی سے پیش آئے، ان کی توہین کرے، اسلام ایک قانون عدل ہے ہر چیز کی ایک حد ہے، اس لئے شرک میں والدین کی اطاعت نہ کرنے کے حکم کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیدیا کہ :''صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفاً ''یعنی دین میں تو تم ان کا کہنا نہ مانو، مگر دنیا کے کاموں میں مثلاً ان کی جسمانی خدمت یا مالی اخراجات وغیرہ اس میں کمی نہ ہونے دو بلکہ دنیوی معاملات میں اس کے عام دستور کے مطابق معاملہ کرو، ان کی بے ادبی نہ کرو، ان کی بات کا جواب ایسا نہ دو جس سے بلاضرورت دل آزاری ہو۔ (۱)

(۱) معارف القرآن:۷/۳۷

غور کیجئے کہ اللہ تعالے اپنے نہ ماننے والوں اور منکر و باغی لوگوں کے سلسلہ میں تاکید فرماتے ہیں کہ ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک اور بھلائی کا معاملہ کرنا چاہیئے، ہاں کفر وشرک میں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے، اس لئے ان کی یہ بات تو مانی نہیں جائے گی، لیکن دنیوی معاملات میں اور ان کی خدمت وتعاون وغیرہ میں مؤمن والدین کی طرح ہی ان کے ساتھ بھی معاملہ ہوگا۔ اگر ایک انسان کا بنایا قانون ہوتو اس میں اپنے باغیوں کے لئے ایسی ہدایت کا پایا جانا ممکن نہیں؛ کیونکہ وہ جس طرح دوستی سے متأثر ہوتا ہے اسی طرح دشمنی سے بھی متأثر ہوتا ہے، اور اس کا بنایا ہوا قانون بھی لامحالہ اس کے خیالات وجذبات سے متأثر ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اسلام کے قانون میں عدل وانصاف ومساوات کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں جیسے بعض مغرب پرست لوگوں کا خیال ہے کہ عورت ومرد دونوں کو ہر اعتبار سے مساوی قرار دیدیا گیا ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ صاحب حق کو اس کا حق پورا پورا دیا گیا ہے، مرد کو اس کے درجہ وحیثیت کے مطابق اور عورت کو اس کے درجہ وحیثیت کے مطابق، وعلی ھٰذا القیاس دوسرے لوگوں کا حق ان کی حیثیتوں اور درجات کے لحاظ سے دیا گیا ہے۔

ہم نے یہاں عورت ومرد کو مثال میں اس لیے پیش کیا ہے کہ آج پورا مغرب اور پوری دنیائے استشراق اور ان سے مرعوب ومتاثر اور ان کے اندھے مقلد، بڑی قوت کے ساتھ اسلام پر عورت کے ساتھ ناانصافی کا الزام عائد کررہے ہیں، انکا کہنا یہ ہے کہ مرد وعورت میں ہر طرح مساوات ہونا چاہیئے، مثلاً مرد کی طرح عورت کو بھی طلاق کا اختیار دینا چاہیئے، اور جس طرح مرد گھر کے باہر کی زندگی گزارتا ہے عورت کو بھی باہر نکلنے، بازاروں میں گھومنے پھرنے، کمانے وجمع

کرنے اور تقریبوں میں آزادی کے ساتھ جانے آنے کی اجازت اور بے پردہ رہنے کا حق دینا چاہئے۔ یہ ہے ان کے نزدیک مساوات و برابری، مگر اسلام کے نزدیک یہ بالکل ناانصافی اور عدم مساوات ہے؛ کیونکہ عورت کی قوت وطاقت، اس کے مزاج وطبیعت اور قابلیت وصلاحیت کی طرف نظر نہ کر کے اس کو مردوں جیسے کام میں لگانا سراسر ناانصافی ہے، کیا بچے اور بڑے دونوں کے ساتھ ایک معاملہ کرنا اور دونوں کو ایک کام میں لگانا کوئی انصاف اور مساوات ہے؟ یہ لوگ جو اسلام پر ناانصافی کا الزام لگاتے ہیں یہ کیوں نہیں کہتے کہ بچوں کو بھی باپ کے کام میں لگنا اور کمانا چاہئے؟ پھر اگر مساوات اور انصاف کا یہی مطلب ہے کہ سب کو ایک ہی کام میں لگنا اور لگانا چاہئے اور سب کو ایک ہی درجہ پر کھڑا کر دینا چاہئے تو ان لوگوں کے نزدیک کیا باپ اور بیٹا دونوں کا درجہ بھی ایک ہے یا ہونا چاہئے؟ کیا اگر باپ کو بیٹے کی غلطی پر مارنے کی اجازت ہے تو بیٹے کو بھی باپ کی غلطی پر مارنے کی اجازت ہونا چاہئے؟ ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی بھی صاحب عقل و دانش اس کو مساوات نہیں کہتا بلکہ یہ عین عدم مساوات ہے۔

حق طلاق کے سلسلہ میں ہم تفصیل سے اوپر لکھ چکے ہیں کہ مرد وعورت کے مزاج و مذاق، حالات واطوار کا طبعی وفطری فرق اسی کا متقاضی ہے کہ عورت کو حق طلاق نہ دیا جائے، اور بصورت دیگر دنیا میں فساد و فتنے کے شدید خطرات ہیں، تفصیل اوپر دیکھ لیجئے، ہم اسی سلسلہ میں ایک اور اعتراض کا جواب عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ میراث میں مرد وعورت کے حصوں میں اسلام نے ناانصافی کی ہے کہ مرد کو بنسبت عورت کے دگنا حصہ دیا جاتا ہے، انکا کہنا ہے کہ دونوں کو برابر برابر حصہ ملنا چاہئے، مگر یہ اعتراض بھی جہالت پر

مبنی ہے، اور اسلام کا قانون سراسر انصاف پر قائم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے عورت کو شروع سے اخیر تک اس طرح کی مالی ذمہ داریوں سے سبک دوش رکھا ہوا ہے جیسی مردوں کی ذمہ داریاں ہیں، اس پر نہ خود اس کی کوئی ذمہ داری ہے اور نہ دوسرے کی، بلکہ پیدائش سے لیکر شادی تک باپ اس کی پوری کفالت کرتا ہے، پھر شادی بھی باپ کرتا ہے، اور شادی کے بعد اس کے تمام اخراجات کی ذمہ داری شوہر پر آجاتی ہے، اور پھر کسی وقت اس کے بیٹوں پر اس کی ذمہ داری آجاتی ہے، نیز اس کو بچے بھی ہوں تو مالی کوئی ذمہ داری عورت پر نہیں، بلکہ یہ ذمہ داری باپ ہی پر ہے حتی کہ مرنے تک وہ اسکی کفالت میں رہتی ہے، پھر مزید یہ ہے کہ مہر کی رقم بھی اس کو ملتی ہے، شریعت نے بذریعہ مہر اسکو معقول رقم دلوانے کا بھی نظام کر رکھا ہے۔

غرض یہ ہے کہ شروع سے آخر تک اس کا پورا بوجھ دوسروں پر ہے، خود اس پر کچھ نہیں، بلکہ اسے صرف سب سے وصول ہی کرتے رہنا ہے، اس کے برخلاف مرد کا مسئلہ یہ ہے کہ بالغ ہوتے ہی اس پر خود اس کی اپنی ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے، اور اس کے ساتھ اس کے ماں باپ اور بھائی بہنوں اور دیگر محتاج رشتہ داروں کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہو جاتی ہے، پھر اپنی شادی کا انتظام بھی عام طور پر خود اسی کو کرنا پڑتا ہے، پھر شادی کرتا ہے تو مہر ادا کرنا بھی اسی کی ذمہ داری ہے، اور بیوی بچوں کے تمام تر اخراجات بھی اس کی اہم ترین ذمہ داریوں میں شامل ہوتے ہیں۔

اب غور کریں کہ جس پر اتنی مالی ذمہ داریاں ہوں اس کو اگر شریعت میراث میں دگنا حصہ دیتی ہے، اور عورت کو جس پر کوئی مالی ذمہ داری اور بوجھ نہیں اس کو اس سے کم دیتی ہے، تو کیا یہ سراسر انصاف اور دیانت اور حق پسندی اور معقولیت کی دلیل نہیں ہے؟

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام کا قانون کبھی بظاہر سمجھ میں نہ آئے تو فوراً اس کو رد کر دینا یا اس پر اعتراض کر دینا خود ایک غیر معقول بات ہے، ہو سکتا ہے کہ جو بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے وہ ہماری سمجھ کا قصور ہو اور ہم سے بڑے عقل والے اس کو سمجھ لیں۔

الغرض اسلام انصاف اور عدل پر مبنی قانون لایا ہے جس کا اعتراف غیر مسلمین بھی کرتے ہیں، چنانچہ مشہور مجاہد آزادی، سروجنی نائڈو نے کہا کہ:

''انصاف کا جوہر اسلام کا بہترین وحیرت انگیز ایک نمونۂ کمال ہے؛ کیوں کہ میں نے جب قرآن پڑھا تو زندگی کے ایسے اصول معلوم ہوئے جو محض مخفی راز ومعمہ نہیں بلکہ زندگی کے معمولات کے لئے قابل عمل اصول اخلاق ہیں، جو تمام دنیا کیلئے مناسب اور موافق ہیں''۔

یہ چند خصوصیات قانون شریعت کی پیش کی گئیں، ویسے تو اس کی بے شمار خصوصیات ہیں مگر آج کا جدید و ماڈرن طبقہ عام طور پر جن باتوں میں شک وتذبذب کا شکار ہے اور اسکی بنا پر اسلام کے قانون پر حملہ کرتا نظر آتا ہے ان کے متعلق شکوک کا رفع کرنا ضروری سمجھ کر ان خصوصیات پر کلام کیا گیا ہے۔

فقط

محمد شعیب اللہ عفی عنہ

۶ / صفر ۱۴۱۶ھ